ملک غلام علیؒ کی یاد میں

(۱)

قاضی حسین احمد

ملک غلام علی صاحبؒ مولانا مودودیؒ کے شاگرد رشید تھے۔ آپ اسلامیہ کالج لاہور کے زمانۂ طالب علمی سے مولانا مودودی کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ مولانا مودودی کی شخصیت ہمہ پہلو تھی۔ وہ علمی انہماک کے ساتھ ساتھ عملی سیاسی میدان میں اسلامی انقلاب کے داعی تھے۔ ایک دینی اور سیاسی جماعت کے بانی اور رہنما کے طور پر بھی اپنی جماعت کی نگرانی بھی کرتے تھے، اور عالمی اسلامی تحریک کے قائد کی حیثیت سے پوری دنیا کی اسلامی تحریکیں بھی ان کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھتی تھیں۔ ملک صاحب نے مولانا مودودی کی فکر، ان کی سیاسی حکمتِ عملی اور ان کے فہم کو پوری طرح جذب کیا، لیکن اپنے لیے علمی اور فکری میدان کو منتخب کیا اور اس کام میں مولانا کے معاونِ خصوصی بن گئے۔ ملک صاحب نے اپنے فرضِ منصبی کو اس خوبی سے نبھایا کہ ملک صاحبؒ اور مولانا مودودیؒ کے اسلوب اور ان کے طرزِ تحریر میں بھی فرق کرنا مشکل تھا۔ مولانا مودودیؒ کے پائے کی علمی شخصیت اگر کسی کو یہ کہہ دے: ملک صاحب! دکھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ آپ میری طرف سے لکھ کر بھیج دیا کریں، تو اعتماد کی اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے۔

ملک غلام علیؒ کی طبیعت میں شگفتگی اور لطیف مزاح کی چاشنی تھی جس نے ان کے عالمانہ انکسار کے ساتھ مل کر ان کی شخصیت کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔

میں ۱۹۷۱ میں افغانستان کے مشہور اسلامی صحافی منہاج الدین گہیز کو لے کر لاہور آیا۔ ان دنوں مولانا صاحبؒ صاحبِ فراش تھے۔ بیماری اور ضعف کی حالت میں چارپائی پر لیٹے لیٹے انھوں نے منہاج الدین گہیز شہید سے مختصر ملاقات کی۔ گہیز شہید نے مولاناؒ کی صحت کے پیشِ نظر ان کے ساتھ طویل بات چیت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور طے ہوا کہ علمی مسائل میں ملک غلام علی صاحب کی رہنمائی حاصل

کی جائے۔ گمبیر صاحب سے ملک صاحب کی طویل علمی گفتگو میں، میں بھی شریک رہا۔ یہ گفتگو ایک جدید اسلامی ریاست میں سیاسی نظام اور خواتین کے دائرہ کار سے متعلق تھی۔ اس ملاقات میں مجھے اندازہ ہوا کہ علمی مسائل میں ملک صاحب "مولانا مودودیؒ" کے موقف کی پوری پیروی کرتے ہیں۔ اور اپنے فاضل استاد کے موقف کے حق میں دلائل و براہین سے مسلح ہیں۔

عمر کے آخری حصے میں ملک غلام علی صاحب کے جوان سال بیٹے ملک انعام اللہ، کابل کے شمال میں پروان کے محاذ پر شہید ہو گئے (۱۷ اگست ۱۹۸۹)۔ یہ افغانستان میں سوویت افواج کی مداخلت کا آخری سال تھا۔ ملک صاحب کے پاس میں تعزیت کے لیے گیا تو انھوں نے سعادت مند بیٹے کے بارے میں بتایا کہ تقریباً پانچ سال سے جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف تھا۔ ملک صاحب کی بیماری کی اطلاع پر لاہور آیا اور ایک ماہ تک والد صاحب کی خدمت میں رہا۔ جب ملک صاحب صحت یاب ہو کر ہسپتال سے گھر واپس آگئے تو پھر والد محترم کی خدمت میں عرض کی: اب مجھے اپنے کام پر جانے کی اجازت دیجیے۔ والدین کو معلوم ہے کہ خود جہاد پر جانے کی نسبت اولاد کو خندہ پیشانی سے جہاد پر رخصت کرنا اور ان کی شہادت کی خبر کو خندہ پیشانی سے سننا اولیاء اللہ کا کام ہے۔ ملک غلام علی صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ دونوں اس بڑی آزمائش میں کامیاب رہے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو قابل رشک ہے اور اس میدان میں ان کے رفقا میں سے ان کے ہم پلہ کم ہی ہیں۔

اپنی اہلیہ کے سامنے جب میں ملک غلام علی صاحب کے صبر و استقامت، ان کی طبیعت کی نرمی اور شیرینی کے پہلو کا ذکر کرتا ہوں تو وہ بتاتی ہیں کہ ملک صاحب کی اہلیہ محترمہ بھی اس لحاظ سے ملک غلام علی صاحب کی شخصیت ہی کا پرتو نظر آتی ہیں۔ یہ سعادت کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی ہے کہ اہل و عیال بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں۔ یہ راہِ خدا میں ملک صاحب کے اخلاص اور للہیت کی برکت تھی کہ ان کا پورا ماحول اس رنگ میں رچا بسا تھا۔

ملک غلام علی صاحب آخری وقت تک سمع و اطاعت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز رہے۔ جماعت کی قیادت کی ذمہ داری ہم جیسے کم مایہ لوگوں پر آپڑی۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے کہ کسی کو اپنے سے کم تر آدمی کی اطاعت کرنی پڑے۔ میں عمر تجربے اور علم و فہم کے لحاظ سے ان کے ہم پلہ نہیں تھا، لیکن محض امیر جماعت کے منصب کی وجہ سے انھوں نے مجھے اپنا مکمل تعاون پیش کیا۔ وہ آخر وقت تک جماعت اور امیر جماعت کے ساتھ رہے۔

ملک صاحب نے جوانی کے عالم میں اسلام کو سمجھا۔ اسے دل و جان سے اپنا طریقِ زندگی بنایا۔ زندگی کے آخری لمحے تک دین کی سربلندی کے لیے ایک نظام کی جکڑ بندیوں کو قبول کیا۔ اس نظام کے

اندر اپنی صلاحیتیں اقامت دین کی جدوجہد کے لیے وقف کیں اور کامل اطاعت و وفاداری کی حالت میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی۔ ان کی زندگی اس ارشاد ربانی کے مطابق تھی:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (اللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَاجْعَلْہُ مِنْ وَّرَثَۃِ جَنَّۃِ النَّعِیْمِ

(۲)

میاں طفیل محمد

مولانا ملک غلام علی صاحب سے میرا تعارف اپریل ۱۹۴۴ میں اس وقت ہوا جب میں وکالت کے بعد ٹھیکیداری، اور ٹھیکیداری کے بعد اپنے ایک رفیق چوہدری محمد انور کے ساتھ شراکت چھوڑ کر مستقل طور پر جماعت کے ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے، نواں کوٹ لاہور سے دارالاسلام پٹھان کوٹ گیا۔ اس سے پہلے میں ملک صاحب اور مرکزِ جماعت کے کسی بھی آدمی کو، سوائے مولانا مودودی صاحب کے، نہیں جانتا تھا۔ دارالاسلام میں مجھے جو رہائشی کوارٹر ملا اس کے ایک طرف ملک غلام علی صاحب، اور دوسری طرف مولانا مودودی صاحب کی والدہ محترمہ، جن کو ہم سب دادی اماں کہتے تھے، رہتی تھیں۔ ملک غلام علی صاحب سے اگلے کوارٹر میں نعیم صدیقی صاحب رہتے تھے۔

ملک غلام علی صاحب کے ابتدائی حالات، جو میرے علم میں آئے ہیں وہ، یہ ہیں کہ وہ سون سکیسر ضلع خوشاب کے ایک بااثر معزز اعوان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی۔ پھر وہ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور میں آ گئے جہاں انھیں مولانا علم الدین سالک جیسے اساتذہ کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ سالک صاحب نے ملک صاحب کی سنجیدہ اور متین و ذہین طبع کے پیش نظر ان پر خاص توجہ دی اور ان کے ذہن و اخلاق کو سنوارا اور جلا دی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل ہو گئے۔ وہاں وہ تھرڈ یا فورتھ ایئر میں پڑھتے تھے کہ مولانا مودودی صاحب اسلامیہ کالج میں دینیات کے اعزازی لیکچرر مقرر ہوئے۔ مولانا مودودی صاحب کے ان لیکچروں سے، ملک صاحب اور ان کے متعدد ساتھی، اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی کایا ہی پلٹ گئی۔ شیخ فقیر حسین مرحوم اور چوہدری غلام جیلانی مرحوم (مدیر و مالک ہفت روزہ ایشیا) بھی مولانا مودودی صاحب کی انھی دنوں کی فتوحات میں سے تھے۔ مولانا مودودی صاحب کے

ان لیکچروں کا شہرہ لاہور کے دوسرے کالجوں میں ہوا تو دوسرے کالجوں کے طلب بھی یہ لیکچر سننے کے لیے آنے لگے۔ چنانچہ کالج کی انتظامیہ نے مولانا کے لیکچر کا انتظام کلاس روم کے بجائے اسلامیہ کالج کے حبیبہ ہال میں شروع کر دیا۔ پنجاب کے انگریز گورنر نے مولانا مودودی صاحب کے تصوّرِ دین و دینیات سے لاہور کے کالجوں کے طلب کو متاثر ہوتے دیکھا تو اس نے وزیرِاعظم پنجاب سکندر حیات خاں کے ذریعہ انجمن حمایت اسلام کے ذمہ داروں پر دباؤ ڈالا کہ وہ مودودی صاحب کا کوئی علاج اور اس صورت حال کا تدارک کریں، جس سے انجمن اور اسلامیہ کالج لاہور کے ذمہ دار سخت پریشان ہو گئے۔ مولانا مودودی صاحب تو یہ خدمت، محض للہ، خدمتِ دین کے طور پر ہی کر رہے تھے، ان کا کوئی ذاتی مفاد تو اس سے وابستہ نہیں تھا۔ اس لیے مولانا مرحوم نے انجمن اور کالج کی انتظامیہ کو پریشان دیکھ کر خود ہی دینیات کی لیکچرر شپ سے استعفیٰ دیا اور ان کی پریشانی کو دُور فرما دیا۔ اسلامیہ کالج سے مولانا مودودی صاحب کی علیحدگی کے بعد ملک غلام علی صاحب بھی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر مولانا کے ساتھ ان کے ہاں آ گئے، اس لیے کہ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک انگریز کی تعلیم گاہیں مسلمان نوجوانوں کے لیے تعلیم و تربیت کے ادارے نہیں بلکہ قتل گاہیں تھیں، جہاں ان کو اپنے دین و ثقافت اور ذوق و کردار سب سے بیگانہ و باغی بنانے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ افسوس ہے کہ یہ ادارے آزادی اور قیام پاکستان کے بعد اصلاحِ احوال کے بجائے سوگنا بد تر مذبحوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

لاہور میں مولانا مودودی صاحب کے ہاں ملک صاحب کے لیے کوئی کام اور گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے ملک صاحب کو جالندھر میں سید عبدالعزیز شرقی صاحب کے ہاں بھیج دیا گیا، جو غالباً وہاں پریس چلاتے تھے۔ سید عبدالعزیز شرقی صاحب ان چار حضرات میں سے ایک تھے، جنھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی طرف سے اپنے ہم خیال ساتھیوں کے لیے پہلی پکار پر لبیک کہا تھا۔

جون ۱۹۴۳ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جاپان کی افواج انڈونیشیا اور سنگاپور وغیرہ کو روندتی ہوئی برما کی مشرقی پاکستان سے ملحق سرحد تک پہنچ گئیں، اور انھوں نے انگریزوں کا، فخرِ برطانیہ کوئین الزبتھ نامی سب سے بڑا جہاز خلیج بنگال میں ڈبو دیا، تو انگریز کو ہندوستان کی بھی فکر لاحق ہو گئی۔ حکومتِ ہند نے بڑے شہروں سے غیر ضروری آبادی کو مضافات میں منتقل ہو جانے کی ہدایت کی، تو مولانا مودودی صاحب بھی اپنے ادارہ ترجمان القرآن اور جماعت اسلامی کے مرکز کے ساتھ اسلامیہ پارک پونچھ روڈ لاہور سے دارالاسلام پٹھان کوٹ چلے گئے۔ ملک غلام علی صاحب بتاتے تھے کہ دارالاسلام پٹھان کوٹ منتقل ہونے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے انھیں جالندھر سے دارالاسلام بلا کر مکتبہ ترجمان القرآن ان کے سپرد کر دیا۔ اور پھر وہ قیام پاکستان کے بعد، مرکزِ جماعت اور رسالہ ترجمان القرآن